پروفیسر توقیر عالم فلاحی*

طلبہ کی شخصیت سازی میں اساتذۂ مدارس کا کردار

اگر بچوں کے پہلے مدرسہ کا مقام یا پہلی تربیت گاہ کی حیثیت گھر کو حاصل ہے اور والدین کی شکل میں جسمانی اور ذہنی نشو ونما میں دو اساتذہ کی سرپرستی انھیں حاصل ہوتی ہے تو مدرسہ یا دینی جامعہ کو وہ مقام حاصل ہے جہاں کے مخصوص ماحول میں متعدد علوم وفنون کے ماہر اساتذہ اخلاص ودلسوزی کے ساتھ طلبہ کی جامع شخصیت کی تیاری میں مشغول ومنہمک ہوتے ہیں۔ دین اسلام کے سچے اور مخلص نمائندہ بنانے کے ساتھ ساتھ گھر، خاندان، قوم، ملک بلکہ پوری انسانی برادری کی خیر وفلاح کے لیے ان کے اندر وہ لعل وگہر پیدا کرتے ہیں جو دنیا کے بازار میں انھیں اہمیت کا حامل بنا دیتے ہیں اور موت کے بعد کی ازلی زندگی میں بے مثل اور لافانی مسرتوں کا استحقاق پیدا کر دیتے ہیں۔

اسلام قولی سے زیادہ عملی مذہب ہے، جس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ اسلام کی شاندار عمارت جن پانچ ستونوں پر قائم ہے [1] ان میں توحید فکری یا نظریاتی بنیاد ہے، جسے ایمان وعقیدہ سے بھی تعبیر کیا جا سکتا ہے اور اس کے علاوہ نماز، زکوۃ، روزہ اور حج، یہ چاروں بنیادیں عملی ہیں۔ یہ کہنا بالکل بجا اور درست ہوگا کہ ایمان وعقیدہ وہ عظیم الشان بنیاد ہے جس کے بغیر یہ چاروں بنیادیں بے حقیقت ہو جاتی ہیں لیکن اس حقیقت کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ اعمال کے ذریعہ ہی ایمان وعقیدہ کا ثبوت ملتا ہے اور اگر اعمال نہیں ہیں تو ایمان وعقیدہ دعوی محض سے بڑھ کر کچھ اور نہیں ہوتا۔ اللہ رب العزت کے نزدیک یہ بات انتہائی گھناؤنی قرار پاتی ہے کہ ایک شخص ایمان کا مدعی تو ہو اور قول کا غازی تو بنتا ہو لیکن اس کے مطالبات ومقتضیات سے غفلت برتتا ہو۔ یہ ارشاد خداوندی اس صداقت پر شاہد عدل ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لِمَ تَقُولُونَ مَا لَا تَفْعَلُونَ. كَبُرَ مَقْتًا عِندَ اللَّهِ أَن تَقُولُوا مَا لَا تَفْعَلُونَ (۲)

اے لوگو جو ایمان لائے ہو! تم لوگ وہ بات کیوں کہتے ہو جسے کرتے نہیں ہو۔ اللہ تعالی کے نزدیک یہ بڑی سنگین بات ہے کہ تم لوگ وہ کہو جو کرتے نہیں ہو۔

* شعبۂ دینیات (سنی)، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

مدارس سے وابستہ امیدیں

مدارس میں زیر تعلیم طلبہ و طالبات قوم و ملت کا بڑا قیمتی اثاثہ ہیں۔ انہی سے یہ توقعات وابستہ کی جاتی ہیں کہ وہ مدارس کے مخصوص ماحول میں تربیت پا کر معاشرہ اور قوم و وطن کے لیے ایسے گوہر نایاب بنیں گے جو حق و صداقت، عدل و انصاف، اخوت و محبت اور ہمدردی و مساوات کی فضا کو عام کریں گے اور سیئات و منکرات کے خلاف محاذ آرا ہوں گے۔ چونکہ دعوت و تبلیغ کا کام مدارس کے وجود کی ضمانت ہے اور یہی مقدس عمل امت مسلمہ کے ہر ہر فرد کی شناخت ہے۔ مدارس میں تعلیم پانے والے طلبہ اور طالبات اس کے سب سے زیادہ مکلف ہیں کہ وہ اس کار عظیم کو اپنی شناخت کا ضامن قرار دے کر اپنی صلاحیتوں کی افزائش کے لیے کوشاں اور سرگرم عمل رہیں۔

تاریخ شاہد ہے کہ دین اسلام نے ایک زندہ دین کی حیثیت سے عرب و عجم اور شرق و غرب میں اپنی حیثیت منوائی۔ لیکن اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اسلام کے علم برداروں نے کردار و عمل کی تلوار سے مدعو اور مخاطب کے قلب و ضمیر کو جھنجھوڑا اور ہدایت کی پیاسی انسانیت نے اسی امتیازی وصف کی بنیاد پر اس کے اندر مقناطیسیت کی صفت پائی اور اللہ کے دین کے وہ پاسبان بن گئے۔

دعوت دین ایک موثر فریضہ

دعوت دین کی آبیاری میں کردار و عمل ہر دور میں انتہائی موثر اور دلنشیں ذریعہ اور محرک کے طور پر قابل قبول رہا ہے اور آج بھی اس مقدس عمل کو دین کے فروغ و اشاعت اور اس کے قیام و استحکام میں ایک موثر عامل کی حیثیت حاصل رہی ہے۔ اس صداقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ کسی بھی مذہب یا طریقہ زندگی کو اصلاً اس مذہب کے مستند اور محفوظ تحریری سرمایوں کی روشنی میں دیکھا جانا چاہیے، جبھی اس مذہب یا طریقہ زندگی سے متعلق معتدل اور صائب رائے قائم کی جا سکتی ہے۔ کیونکہ کسی مذہب یا طریقہ زندگی کے ماننے والے بعض تحفظات و مفادات اور احکام و تعلیمات کی غلط تعبیرات و تفہیمات کی بنا پر عملی لحاظ سے قاصر و کوتاہ ہو سکتے ہیں اور اس طرح مذہب کی غلط نمائندگی ہو سکتی ہے۔ لیکن یہ بھی سچ ہے کہ کسی بھی مذہب کو پڑھنے اور سمجھنے والوں کی تعداد ہر دور میں کم رہی ہے اور بالعموم مذہب کی قدر و قیمت کا اندازہ مذہب کے ماننے والوں کے کردار و عمل سے لگایا جاتا ہے۔ اگر کسی مخصوص مذہب کے پیروکی عملی زندگی اوصاف حسنہ سے مزین ہے اور اخوت و محبت اور دیگر انسانی اقدار و اوصاف کی ترجمان ہے تو مدعو یا مخاطب شخص کے دل و دماغ پر اس مذہب کی عظمت نقش ہو جاتی ہے، یہاں تک کہ وہ خود ہی اس مذہب کا مبلغ بن جاتا ہے۔

داعی کے اوصاف

دعوت کی راہ میں قول وفعل میں مطابقت، کشادہ ظرفی، رواداری، غمگساری، امانت کی ادائیگی، ایفاءِ عہد، عدل وانصاف کے قیام کے لیے فکرمندی، ظلم وناانصافی کے خلاف محاذ آرائی، اچھائیوں کو فروغ دینے کی جدوجہد اور برائیوں کے انسداد کے اقدام وعمل، یہ سب اخلاق وکردار کے وہ مظاہر ہیں جو دعوت حق کے پراثر اور سحر انگیز ہونے کی ضمانت بنتے ہیں۔ دعوت الی اللہ کے لیے حکمت عملی کی قرآنی تعلیم (۳) بہت ہی پر معنی ہے۔ داعی کیلئے اس سے بڑی حکمت عملی (Practical wisdom) یا تدبیر (Strategy) کوئی اور نہیں ہوسکتی کہ داعی اپنی شخصیت کو کردار وعمل کے زیور سے آراستہ کرے۔

اساتذہ بطور نمونہ

اساتذۂ مدارس کی یہ ذمہ داری ہے کہ اپنے تلامذہ کے لیے وہ خود بھی کردار وعمل کا نمونہ بنیں اور اپنے طلبہ کے تئیں حساس وبیدار مغز رہیں کہ ان کے اندر وہ خلاف شان اخلاق نشو ونما نہ پائیں جن سے مادر درس گاہ کی اور یہاں کے اساتذہ وانتظامیہ کی غلط تصویر سامنے آئے اور نتیجتاً نوجوان نسل کی شکل میں قوم کی یہ امانت قوم وملت کی امیدوں اور تمناؤں کو پامال کردے۔ اگر اساتذہ وانتظامیہ طلبہ کے کردار وعمل کے تئیں فکرمندی کا ثبوت دیں اور اخلاق حسنہ اور اقدار عالیہ کی نشو ونما کو مرکز توجہ بنائیں تو دینی اداروں کے قیام کا مقصد پورا ہوگا اور مدارس کے ماحول سے نکلے ہوئے ملت کے جیالے اپنی بھلائی کے ساتھ ساتھ پوری قوم بلکہ پورے ملک کی خیر وفلاح میں زبردست عامل بن سکیں گے۔

مطالعہ کی طرف مائل کرنا

بلندیٔ اخلاق کی منزل کی بازیافت اسی وقت ممکن ہے جب خود مدارس کے اساتذہ وانتظامیہ کے افراد عملی لحاظ سے ان طلبہ کے سامنے نمونہ بن جائیں۔ تلامذہ کے تئیں اخلاق عالیہ کی افزائش میں اہل مدارس کی یہ بھی ذمہ داری ہے کہ وہ مقدس مشن اور عظیم الشان کام دعوت الی اللہ (۴) کا انھیں خوگر بنائیں اور اس کے موثر ہونے میں اخلاق وکردار کی رفعت کو بے نقاب کریں۔ اس سلسلے میں طلبہ کو ان کتب کے مطالعہ کی طرف بھی راغب کرنا ہوگا جو امت اور افراد امت کے مقام ومرتبہ اور انسانیت کی فلاح وبہبود کے تئیں ان کی ذمہ داریوں کو واضح اور دلنشیں انداز میں وا کرتی ہوں اور دوسری طرف اسلاف کی پرنور اور مثالی زندگیوں کو طشت ازبام کرتی ہوں۔

قلبی کشادگی وفراخدلی

ایک بڑی ذمہ داری جو اساتذۂ مدارس پر عائد ہوتی ہے، وہ یہ کہ وہ خود بھی فراخ ذہن اور کشادہ

قلب ہوں اور طلبہ وطالبات میں اس وصف کونشو ونما دینے کے لیے کوشاں وسرگرم عمل ہوں۔اس تربیت کے نتیجے میں طلبہ کے اندر اس وسعت ظرفی اور انسانوں کے مابین بھائی چارگی کا آفاقی تصور پیدا ہوگا اور ان کا وجود انسانیت کے لیے خوشگوار اور فال نیک ثابت ہوگا۔ برادری کا عالمگیر تصور قرآن مجید ان الفاظ میں دیتا ہے:

يَآ أَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُم مِّن نَّفْسٍ وَاحِدَةٍ وَخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيرًا وَنِسَاءً (۵)

اے لوگو! اپنے اس رب سے ڈرو جس نے تم لوگوں کو ایک جان سے پیدا کیا اور اس سے اس کا جوڑا بنایا اور ان دونوں سے بہت سے مردوں اور عورتوں کو پھیلا دیا۔

اخوت اور بھائی چارگی کے آفاقی تصور کو قرآن مجید کی یہ آیت کریمہ بھی مبرہن کر دیتی ہے:

يَآ أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُم مِّن ذَكَرٍ وَأُنثَىٰ وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا (۶)

اے لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور تم کو گروہوں اور قبائل میں بنا دیا تاکہ تم ایک دوسرے سے متعارف ہو سکو۔

گویا انسان چاہے جس خطۂ ارض سے تعلق رکھتا ہو اور جس رنگ ونسل کا مدعی اور جس گروہ و قبیلہ کا حامی ہو، اس کے دوسرے انسانوں پر حقوق ہیں اور دوسرے انسانوں کے تئیں اس پر کچھ فرائض عائد ہوتے ہیں۔

انسانیت کا سبق

رشتۂ انسانیت ہی وہ رشتہ ہے جو دنیا کے تمام لوگوں کو ایک دوسرے کیلئے جینے کا سبق سکھاتا ہے۔

مذہب اسلام میں برادری کے آفاقی اور عالمگیر تصور کی معنویت اس حدیث قدسی سے بھی عیاں ہوتی ہے:

إِنَّ اللهَ عَزَّ وَجَلَّ يَقُولُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ يَا ابْنَ آدَمَ مَرِضْتُ فَلَمْ تَعُدْنِي قَالَ يَا رَبِّ كَيْفَ أَعُودُكَ وَأَنْتَ رَبُّ الْعَالَمِينَ قَالَ أَمَا عَلِمْتَ أَنَّ عَبْدِي فُلَانًا مَرِضَ فَلَمْ تَعُدْهُ أَمَا عَلِمْتَ أَنَّكَ لَوْ عُدْتَهُ لَوَجَدْتَنِي عِنْدَهُ يَا ابْنَ آدَمَ اسْتَطْعَمْتُكَ فَلَمْ تُطْعِمْنِي قَالَ يَا رَبِّ كَيْفَ أُطْعِمُكَ وَأَنْتَ رَبُّ الْعَالَمِينَ قَالَ أَمَا عَلِمْتَ أَنَّهُ اسْتَطْعَمَكَ عَبْدِي فُلَانٌ فَلَمْ تُطْعِمْهُ أَمَا عَلِمْتَ أَنَّكَ لَوْ أَطْعَمْتَهُ لَوَجَدْتَ ذَلِكَ عِنْدِي يَا ابْنَ آدَمَ اسْتَسْقَيْتُكَ فَلَمْ تَسْقِنِي قَالَ يَا رَبِّ كَيْفَ أَسْقِيكَ وَأَنْتَ رَبُّ الْعَالَمِينَ قَالَ اسْتَسْقَاكَ عَبْدِي فُلَانٌ فَلَمْ تَسْقِهِ أَمَا إِنَّكَ لَوْ سَقَيْتَهُ وَجَدْتَ ذَلِكَ

عندی (۷)

بلاشبہ اللہ تعالیٰ قیامت کے روز ایک بندے سے فرمائے گا کہ آدم کے بیٹے! میں بیمار تھا اور تو نے میری عیادت نہیں کی۔ تو بندہ تعجب سے کہے گا کہ اے میرے آقا! میں تیری عیادت کیسے کرتا، حالانکہ تو دونوں جہاں کا رب ہے۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ کیا تمہیں نہیں معلوم تھا کہ میرا فلاں بندہ بیمار تھا اور تو نے اس کی عیادت نہیں کی۔ اگر تو اس کی عیادت کرتا تو تو مجھے اس کے قریب پاتا۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ ایک بندے سے فرمائے گا اے آدم کے بیٹے! میں نے تم سے کھانا مانگا تھا لیکن تو نے مجھے کھانا نہیں کھلایا، تو بندہ حیرت سے عرض کرے گا کہ اے میرے آقا! آپ تو ساری دنیا کے پالنہار ہیں، آپ کو میں کیسے کھانا کھلاتا۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ کیا تمہیں نہیں معلوم کہ میرے فلاں بندے نے تجھ سے کھانا مانگا تھا لیکن تو نے اسے کھانا نہیں دیا۔ کیا تمہیں معلوم نہیں تھا کہ اگر تو نے اسے کھانا کھلایا ہوتا تو تو نے اسے میرے پاس پایا ہوتا۔ اسی طرح وہ ایک بندے سے فرمائے گا کہ میں پیاسا تھا، لیکن تو نے مجھے پانی نہیں پلایا تھا تو بندہ (حیرت واستعجاب سے) کہے گا کہ اے میرے آقا! آپ تو پوری دنیا کو سیراب کرنے والے ہیں، آپ کو میں کیسے پانی پلاتا۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ میرے فلاں بندے نے تجھ سے پانی مانگا تھا، لیکن تو نے اسے پانی نہیں پلایا۔ سنو! اگر تو نے اسے پانی پلایا ہوتا تو تو اسے میرے پاس پاتا۔

انسانی قدروں کا تحفظ

مدارس کی مخصوص چہاردیواری میں جہاں اساتذہ کرام سے یہ توقع ہوتی ہے کہ وہ اپنی شخصیت کو توسع اور بہبودی انسانیت کا ترجمان بنائیں، وہیں ان سے یہ تقاضا بھی ہوتا ہے کہ جویائے تعلیم وتربیت طلبہ و طالبات کے اذہان وقلوب میں قرآن وسنت کی ان تعلیمات کی آبیاری کریں جو تمام انسانوں کے ساتھ حسن سلوک اور غمخواری کی ترجمان ہیں۔ مدارس کا امتیاز اس میں قطعاً نہیں ہے کہ شب وروز زبان پر قال اللہ اور قال الرسول کی صدائیں ہوں یا ان کی انفرادیت کی ترجمانی اس سے بھی نہیں ہوتی کہ چند احادیث مبارکہ اور قرآن پاک کی آیات کو ذہنوں میں محفوظ کرلیا جائے، ہدایہ اور قدوری کی عبارتیں ذہن نشین کرلی جائیں اور مخصوص نقطہ نظر یا مسلک فکر پر طبع آزمائی کرتے ہوئے فرقہ بندی اور مسلک پرستی کے جذبہ وعمل کو شہ دیا جائے، بلکہ ان مدارس کا امتیاز اس میں مضمر ہے کہ پاکیزہ اور روحانی ماحول میں انسانی قدروں کے تحفظ کا سبق حاصل کیا جائے، پوری انسانی برادری کے تئیں جذبات اخوت ومحبت کی افزائش کی جائے، انسانیت، بشردوستی اور ہمدردی خلائق سے متعلق قرآن وحدیث کی تعلیمات کو اس سلسلے میں راہنما

نقوش کے طور پر اختیار کیا جائے تا کہ عملی زندگی میں اسلام کے صحیح نمائندے بن کر ملک اور معاشرے میں بلکہ پوری دنیا میں حتی المقدور اسلام کی درخشاں تصویر پیش کی جا سکے۔

مسلکی تشدد سے اجتناب

مسلکی تشدد آج امت مسلمہ کے لیے عفریت ہے جو امت کی وحدت کو پارہ پارہ کر کے ظاہری اور معنوی دونوں لحاظ سے کمزور و ناتواں بنا دیتا ہے اور دوسری طرف یہ امت افراد معاشرہ اور اقوام عالم میں ایک پستہ قد اور شکست خوردہ امت کی حیثیت سے متعارف ہوتی ہے۔ یہ مسلکی تشدد صرف امت مسلمہ کے وجود کو ہی مجروح نہیں کرتا بلکہ کسی بھی ملک اور قوم کے خوشنما چہرے پر داغ بن کر ابھرتا ہے۔ ایسے حالات میں یکجہتی اور اتفاق کے منصوبے کما حقہ کارگر ثابت نہیں ہوتے اور نتیجتاً ملک وقوم کو بھی خسارہ اٹھانا پڑتا ہے۔

اتحاد امت کی تلقین

مدارس کے اساتذہ سے نہ تو اس بات کا مطالبہ ہوتا ہے اور نہ ہی یہ مقصود ہے کہ تمام لوگ ایک مسلک اور ایک مکتبۂ فکر کے نمائندے بن جائیں اور طلبہ کو بھی اسی نہج پر چلنے کے لیے مجبور کریں۔ نہ ہی یہ ممکن ہے اور نہ ہی اس کی ضرورت ہے۔ ہاں مسالک اور مکاتب فکر کے اختلاف کے باوجود اساتذہ آپس میں ایک دوسرے کے تئیں رواداری اور فراخ ذہنی کا ثبوت دیں، جزئیات میں مختلف الخیال ہونے کے باوجود اصول اور کلیات میں ملت واحدہ ہونے کا عملی ثبوت پیش کریں اور ایک دوسرے کے مخصوص مسلک اور نقطۂ نظر کو قدر کی نگاہوں سے دیکھیں۔ یہ عملی نمونہ جب مدارس کے طلبہ وطالبات کے سامنے ہوگا تو ان کے سامنے اختلاف امتی رحمۃ ہونے کی معنویت بے نقاب ہوگی اور میدان عمل میں ان کا موقر وجود بھی تسلیم کیا جا سکے گا۔

مناظرہ بازی سے اجتناب

طلبہ اور طالبات کے اندر مناظرہ اور مناقشہ کے رجحانات کو فروغ دینا صحت مند فکر وخیال کی غمازی نہیں ہے۔ علمبرداران اسلام آپس میں انا اور تعلّی کے جذبے سے معمور ہو کر مناقشہ اور مناظرہ کی روش اختیار کریں اور خلاف شان رویہ کا مظاہرہ کریں یہاں تک کہ ایک دوسرے کو کفر والحاد کے فتووں سے نوازیں، یہ افراد امت کی شان سے فروتر عمل ہے، بلکہ یہ عمل عام متبعین اسلام کے لیے خلوص وللّٰہیت کے ساتھ اسلام سے وابستگی میں ایک بڑے حارج اور زبردست مزاحم کی حیثیت رکھتا ہے اور آپسی انتشار و افتراق کے لیے فضا ہموار کرتا ہے۔ انجام کار یہ ہوتا ہے کہ شیرازۂ وحدت منتشر ہو جاتا ہے، آپس میں

گروہوں اور جماعتوں کا وجود عمل میں آتا ہے اور ہر گروہ یا ہر جماعت کل حزب بما لدیہ فرحون (۸) کے مطابق اپنی حیثیت منوانے کے لیے فکر مند اور کوشاں رہتی ہے اور دوسرے کو مجروح کرنے میں جذبہ مسابقت کا ثبوت دیتی ہے۔ گویا یہی نہیں کہ امت داخلی مشکلات وخوارج میں گھرے رہنے کی وجہ سے کمزور دور ماندہ ہوجاتی ہے بلکہ قومی، ملکی اور عالمی سطح پر اس کی شبیہ خراب ہوجاتی ہے۔

موت کی یاد

آج دنیا میں ایک دوسرے کے حقوق پر دست درازی کی جارہی ہو یا مال وجان اور عزت وآبرو کو ناپاک عزائم کا ہدف بنایا جارہا ہو، باہمی عداوت ومنافرت کے شہ پانے کی بات ہو یا کمزوروں اور زیر دستوں پر ظلم وتعدی کا معاملہ، ان تمام قلق انگیز اور انسانیت سوز احوال کے وقوع پذیر ہونے کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ آج انسان موت کے بعد کی زندگی میں جوابدہی کے احساس کو بالائے طاق رکھ چکا ہے اور دنیوی مفادات ولذائذ اس کا مرکز توجہ بلکہ ہدف ومقصود بن گئے ہیں۔ یقیناً قرآن وسنت کی روشنی میں دنیا یا متاع دنیا شجر ممنوع نہیں ہے، بلکہ اگر مال جائز طریقے سے حاصل کیا جارہا ہو اور جائز مصارف میں استعمال ہورہا ہو، اسی طرح اگر اولاد صالح ہو اور دین داری کی راہ پر چلتے ہوئے مومن کی آنکھوں کی ٹھنڈک بن رہی ہو (۹) تو یہ دنیا 'حسنۃ' بن جاتی ہے جس کے لیے بندۂ مومن شب وروز کی نمازوں میں بھی اور دیگر اوقات میں بھی مالک حقیقی کے سامنے دست بدعا ہوتا ہے (۱۰) اسکے برعکس یہ دنیا اگر ناجائز طریقے سے حاصل کی جارہی ہو اور ناجائز مصارف میں استعمال ہورہی ہو اور اولاد اگر دین دارانہ روش سے منحرف ہوتے ہوئے بندۂ مومن کی آنکھوں کی شہتیر بن رہی ہو تو یہ مال واولاد زحمت اور مصیبت ہیں۔ (۱۱)

قرآن وسنت کے اس تصور کی آبیاری اور اس جہت سے طلبہ مدارس کی ذہن سازی کے لیے مدارس دینیہ کا ماحول بڑا ہی سازگار ثابت ہوتا ہے۔ ماحول اور معاشرے میں لعل وگہر بن کر نکلنے والے طلبہ اس فکر کی افزائش میں تردد وتذبذب کے شکار نہیں ہوتے بلکہ بطیب خاطر اسے قبول کرتے ہیں اور اس نقطۂ نظر کے فروغ میں عملی طور پر فعالیت کا ثبوت دیتے ہیں۔

عزلت نشینی سے اجتناب

یقیناً قرآن مجید اور سنت رسول اللہ کی روشنی میں یہ تعلیم سامنے آتی ہے کہ یہ دنیا دارالعمل اور دارالاسباب ہے۔ (۱۲) اسباب ووسائل کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا یا انہیں چھوڑ کر گوشہ گیر نہیں ہوا جاسکتا۔ ترک دنیا یا عزلت نشینی سادھوانہ طرز زندگی ہے اور قرآن مجید اس کے خلاف علم بلند کرتا ہے۔ فرمان باری تعالیٰ ہے:

وَرَهْبَانِيَّةً ابْتَدَعُوهَا مَا كَتَبْنَاهَا عَلَيْهِمْ إِلَّا ابْتِغَاءَ رِضْوَانِ اللَّهِ فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ

وَرَهْبَانِيَّةً ابْتَدَعُوهَا مَا كَتَبْنَاهَا عَلَيْهِمْ إِلَّا ابْتِغَاءَ رِضْوَانِ اللَّهِ فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا (۱۳)

اور رہبانیت انھوں نے خود ایجاد کرلی۔ ہم نے اسے ان پر فرض نہیں کیا تھا۔ مگر اللہ کی خوشنودی کی طلب میں انھوں نے آپ ہی یہ بدعت نکالی اور پھر اکی پابندی کرنے کا جو حق تھا اسے ادا نہیں کیا۔

دوسری طرف بندۂ مومن کے لیے دنیا مرغوب ومحبوب یا مطلوب ومقصود نہیں ہے۔ بلکہ قائم ودائم رہنے والی آخرت کی زندگی ہی بندۂ مومن کی منزل مقصود اور متاع گراں مایہ ہے۔ اس فکر کو ذہن نشیں کرانے کے لیے قرآن مجید میں متعدد مقامات پر دنیا کی بے بضاعتی کو بیان کیا گیا ہے۔ ایک جگہ تمثیلی انداز میں دنیا کی کم مائیگی اور اس کے بودے پن کو واضح کیا جاتا ہے۔ رب العالمین کا یہ فرمان ملاحظہ فرمایئے:

اِعْلَمُوا أَنَّمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ وَّزِيْنَةٌ وَّتَفَاخُرٌ م بَيْنَكُمْ وَتَكَاثُرٌ فِي الْأَمْوَالِ وَالْأَوْلَادِ كَمَثَلِ غَيْثٍ أَعْجَبَ الْكُفَّارَ نَبَاتُهُ ثُمَّ يَهِيْجُ فَتَرٰهُ مُصْفَرًّا ثُمَّ يَكُوْنُ حُطَامًا (۱۴)

جان لو کہ یہ دنیا کی زندگی اس کے سوا کچھ نہیں کہ ایک کھیل اور دل لگی اور ظاہری ٹیپ ٹاپ اور تمہارا آپس میں ایک دوسرے پر فخر جتانا اور مال واولاد میں ایک دوسرے سے بڑھ جانے کی کوشش کرنا ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک بارش ہوئی تو اس سے پیدا ہونے والی نباتات کو دیکھ کر کاشت کار خوش ہو گئے۔ پھر وہی کھیتی پک جاتی ہے اور تم دیکھتے ہو کہ وہ زرد ہو گئی پھر وہ بھس بن کر رہ جاتی ہے۔

دنیا کی اس زوال پذیری اور بے ثباتی کو نبی کریمؐ کے مقدس فرامین میں بھی ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔

ایک موقع پر رسالتمآبؐ نے فرمایا:

الدُّنْيَا سِجْنُ الْمُؤْمِنِ وَجَنَّةُ الْكَافِرِ (۱۵)

دنیا مومن کے لیے قید خانہ ہے اور کافر کے لیے جنت ہے۔

دنیا کی زوال پذیری

دنیا کے بے وزن ہونے اور اس کے بے وقعت ہونے کا اندازہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان سے بھی ہوتا ہے جس میں اس کی مثال سمندر میں ڈبوئی ہوئی انگلی کے ناخن پر باقی رہنے والی تری سے دی گئی ہے۔ (۱۶)

آخرت کیلئے تیاری: قرآن وسنت کی روشنی میں ایک طرف تو دنیا کی بے وقعتی اور بے ثباتی سامنے آتی ہے اور دوسری طرف آخرت کی ابدی زندگی کے لیے فکرمند ہونے، تیار رہنے بلکہ اس سلسلے میں

جذبۂ مسابقت کا مظاہرہ کرنے کی تلقین کی جاتی ہے۔ایک جگہ اللہ رب العزت کا ارشاد ہوتا ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَلْتَنظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ (۱۷)

اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اللہ سے ڈرو اور ہر شخص کو اس بات کے لیے فکرمند رہنا چاہیے کہ اس نے کل کی زندگی کے لیے کیا بھیج رکھا ہے۔

ایک جگہ فرمان باری تعالیٰ ہے:

سَابِقُوا إِلَىٰ مَغْفِرَةٍ مِّن رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا كَعَرْضِ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ أُعِدَّتْ لِلَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ وَرُسُلِهِ (۱۸)

ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرو اپنے رب کی مغفرت اور اس جنت کی طرف جس کی وسعت آسمان وزمین جیسی ہے۔ جو تیار کی گئی ہے ان لوگوں کے لیے جو اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لائے ہیں۔

استغفار کی ترغیب: مغفرت الٰہی اور آخرت کی ابدی اور لازوال کامیابی کے حصول کی ترغیب وتشویق اس آیت کریمہ میں بھی واضح ہے:

وَسَارِعُوا إِلَىٰ مَغْفِرَةٍ مِّن رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمَاوَاتُ وَالْأَرْضُ أُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِينَ (۱۹)

دوڑ چلو اس راہ پر جو تمہارے رب کی بخشش اور اس جنت کی طرف جاتی ہے جس کی وسعت زمین اور آسمانوں جیسی ہے اور جو تیار کی گئی ہے خدا ترس لوگوں کے لیے۔

صحیح وغلط میں تمیز: حدیث پاک میں ایسے شخص کو دانا وبینا اور عاقل وفرزانہ سے تعبیر کیا جاتا ہے جو دنیا کی اس زندگی میں صحیح وغلط اور جائز وناجائز میں تمیز کرتے ہوئے اور اپنے نفس کو قابو میں رکھتے ہوئے زندگی گذارے اور یہ کہ اس کی زندگی کا ہر عمل ابدی زندگی کی قیام گاہ کے حصول سے متعلق ہوجائے۔ رسالتمآبؐ کے یہ الفاظ قابل ملاحظہ ہیں:

اَلْكَيِّسُ مِنَّا مَنْ دَانَ نَفْسَهُ وَعَمِلَ لِمَا بَعْدَ الْمَوْتِ (۲۰)

ہم میں سے ذی فطین وہ ہے جو اپنے نفس کو قابو میں رکھے اور موت کے بعد کی زندگی کیلئے عمل کرے۔

دنیا اور سامان دنیا کے تعلق سے دینی جامعات کے طلبہ وطالبات میں یہ شعور پختہ کرنا کہ اس فانی زندگی کے سامان عیش وعشرت بھی فانی ہیں اور یہ کہ ان پر فریفتہ ہوکر لافانی زندگی کی مسرتوں سے محرومی ہاتھ آتی ہے۔ عقل ودانش کا تقاضا ہے کہ عبوری زندگی پر مستقل اور ابدی زندگی کو ترجیح دی جائے، اس زوال پذیر اور تغیر آشنا دنیا کے اسباب ووسائل کو لافانی دنیا کی لذتوں کے حصول کے لیے استعمال کیا جائے

اور فکر و عمل اور سعی و کاوش کا محور اس زندگی کو بنایا جائے جو کبھی ختم ہونے والی نہیں ہے اور وہاں جو عیش و عشرت میسر ہوگی اس کو کبھی فنا نہیں ہے۔ اساتذہ اور تلامذہ کے مقدس اور روحانی رشتوں کے اس معدن و مرکز میں فانی اور لافانی زندگی سے متعلق ان افکار عالیہ کا چلن عام ہو جائے اور صحیح معنوں میں طلبہ کی شخصیت دنیا اور آخرت سے متعلق درخشاں قرآنی افکار کی ترجمان بن جائے تو بلا تردد یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ ایسے طلبہ جب عملی زندگی میں قدم رکھیں گے تو خود اپنے گھر اور خاندان کے لیے اور دوسری طرف معاشرہ اور ملک کے لیے مفید و سودمند ثابت ہوں گے۔ اس لیے کہ دولت و ثروت سے بے جا محبت کے لیے ان کے دل میں گنجائش نہیں ہوگی، دنیا کی بے ثباتی سے وہ واقف ہوں گے اور آخرت کی ابدی زندگی کی لازوال کامیابی ان کے مطمح نظر ہوگی، اس لیے وہ جہاں کہیں بھی رہیں گے اپنی ذمہ دارانہ حیثیت کو فراموش نہ کر سکیں گے۔ چنانچہ ایسے لوگ دوسروں کے حقوق و مراعات کے تحفظ اور جان و مال اور عزت و آبرو کی بقا کو فریضہ قرار دے کر دنیا کے بازار میں سرگرم عمل رہیں گے۔

فساد فی الارض سے اجتناب: خدا کی زمین کو فساد سے بھر دینے کی جو شازشیں اختیار کی جاتی ہیں اور جن نت نئے حربوں کا استعمال کیا جاتا ہے ان میں ایک انتہائی مذموم و مسموم حربہ یہ ہے کہ دوسروں کے مذاہب اور ان کے مقدسات پر طعنہ زنی اور سب و شتم کا طریقہ اختیار کیا جائے۔ ضلعی سطح پر ہو یا صوبائی سطح پر، ملکی سطح پر ہو یا بین الاقوامی سطح پر اگر اس قسم کے جذبات اور اقدامات کسی بھی مذہب کے علمبردار کی طرف سے ہوں، بہر حال خوشگوار ماحول کو مکدر کرنے کا سبب بنتے ہیں۔ اس اعتراف حقیقت سے گریز نہیں کیا جانا چاہیے کہ قومی اور بین الاقوامی دونوں سطح پر وقتاً فوقتاً مذہب کے معتقدات اور مقدسات پر طعنہ زنی اور ہرزہ سرائی کی جاتی ہے جس کی بنیاد پر حالات خراب ہوتے ہیں اور یہ عمل ایک طرف کسی بھی ملک یا قوم کی وحدت و سالمیت اور ترقی و کامرانی کی راہ میں مانع اور مزاحم بنتا ہے تو دوسری طرف اس کی شبیہ ملکی سطح پر بھی اور عالمی سطح پر بھی مخدوش ہو جاتی ہے۔ ان حالات میں قرآن و سنت کے امین اور اخلاقی قدروں کے محافظ مدارس ہی وہ کارہائے نمایاں اور خدمات جلیلہ انجام دے سکتے ہیں جن کی بنا پر ملک میں امن کا ماحول بن سکتا ہے اور اقوام عالم میں ایک صحت مند اور توانا ملک کی حیثیت سے اس کی شناخت قائم ہو سکتی ہے۔

اساتذۂ مدارس اور ذمہ داران ادارہ کی توجہ طلبہ کی اچھی تربیت اور کردار سازی پر مرکوز ہوتی ہے اور اخلاص و دلسوزی کے ساتھ وہ انھیں قوم کی امانت سمجھتے ہیں۔ اللہ رب العزت کی بارگاہ میں مسئول و جوابدہ ہونے کے علاوہ اس عارضی دنیا میں بھی قوم و ملت کے مواخذہ کا احساس انھیں کچوکے لگاتا ہے اور دوسری طرف ملک و ملت کے لیے ماڈل کی شکل میں تیار شدہ طلبہ کے درخشاں مستقبل کا تصور انھیں مہمیز کرتا ہے کہ ان کی شخصیت کو آراستہ و مزین کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا جائے۔

مدارس کی شناخت ہی اس سے ہے کہ وہ مثالی داعی پیدا کرتے ہیں اور بلاشبہ وسعت ظرفی، تحمل، کشادہ قلبی، بشر دوستی، داعیانہ اوصاف کے لوازم ہیں۔ چنانچہ اللہ کے وہ بندے جو اس کے عطا کیے گئے ضابطۂ زندگی کی شکل میں اسلام کی عظیم ترین نعمت سے محروم ہیں ان پر اوران کے معبودوں پر سب وشتم کی سختی سے ممانعت کی جاتی ہے۔ قرآن مجید کی یہ تعلیم ہے:

وَلَا تَسُبُّوا الَّذِينَ يَدْعُونَ مِن دُونِ اللَّهِ فَيَسُبُّوا اللَّهَ عَدْوًا بِغَيْرِ عِلْمٍ (۲۱)

یہ لوگ اللہ کے سوا جن کو پکارتے ہیں انھیں گالیاں نہ دو، کہیں ایسا نہ ہو کہ (یہ شرک سے آگے بڑھ کر) جہالت کی بنا پر اللہ کو گالیاں دینے لگیں۔

مقدسات کا احترام: گویا فرقہ واریت کو شہ دینے والے عوامل واسباب کی بیخ کنی کے ساتھ ہی ساتھ دوسرے مذاہب کے معابد ومقدسات کا احترام اور ان کی حفاظت کی تعلیم وتلقین قرآن وسنت کی تعلیمات سے مستنبط ہے اور تاریخ اس بات پر شاہد ہے کہ اسلامی حکومت میں غیر مسلم شہریوں کو پوری آزادی تھی کہ وہ اپنے مذہب پر عمل پیرا ہوں اور پیش آمدہ امور ومسائل میں فیصلے ان کی مذہبی تعلیمات کے مطابق ہوں۔ ان کی عبادت گاہوں کی حفاظت بھی اسلامی حکومت کی اہم پالیسیوں میں تھی۔ دوسرے مذاہب کے علمبرداروں، ان کی مقدس کتب اور عبادت گاہوں کے تئیں رواداری اور کشادہ ظرفی کی تعلیم اور مدارس دینیہ میں اس کے روح پرور مظاہر مدارس کو ہدف تنقید بنانے والوں کو آج بھی دعوت غور وفکر دیتے ہیں۔

آج عالمی سطح پر اسلام اور مسلمانوں کو زک پہنچانے کی کوششیں کی جارہی ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ اسلام کی آفاقیت، جامعیت اور اس کی سحر انگیزی سے اعداء اسلام ہراساں وپریشاں ہیں۔ اسلام کی بڑھتی ہوئی مقبولیت سے انھیں خطرہ لاحق ہے۔ اس لیے اس کی عظمت ومعنویت کو وہ مخدوش ومجروح کرنے کی سازشیں کررہے ہیں۔ قرآن مجید نے اعداء اسلام کی ان کوششوں کی تصویر کشی اپنے زمانہ نزول میں کی تھی، لیکن کم وبیش ساڑھے چودہ سو سال قبل کا یہ اعلان آج کے دور پر پوری طرح صادق آتا ہے:

يُرِيدُونَ لِيُطْفِئُوا نُورَ اللَّهِ بِأَفْوَاهِهِمْ وَاللَّهُ مُتِمُّ نُورِهِ وَلَوْ كَرِهَ الْكَافِرُونَ (۲۲)

وہ لوگ چاہتے ہیں کہ اللہ کے نور کو اپنے منہ کے پھونکوں سے بجھادیں لیکن وہ اپنے نور کو مکمل کرکے رہنے والا ہے۔

اسلام اور مغرب کی کشمکش: آج مشرق ومغرب کے تمام اغیار واجانب اسلام اور اہل اسلام کو مجروح کرنے پر متفق نظر آتے ہیں۔ بالخصوص اہل مغرب نے صلیبی جنگوں میں شرمناک ہزیمت وپسپائی کے بعد قلم وقرطاس کا سہارا لیا ہے اور فکری محاذ آرائی کا بیڑا اٹھایا ہے۔ قرآن مجید، محمد عربیؐ، ازواج مطہرات،

پردہ، غلامی، حقوق نسواں اور عدل و مساوات، ان کے خاص موضوعات ہیں جن پر یہ حضرات اپنے ذہن و فکر کی قوت اور قلم و قرطاس کا سرمایہ صرف کرتے ہیں۔ ان کی علمی اور تحقیقی کاوشوں کا بالعموم مقصد یہ ہوتا ہے کہ اسلام کو ادیان و مذاہب کی بزم میں طفل مکتب ثابت کیا جائے جو اپنی خامیوں اور کوتاہیوں سے بھرا ہوتا ہے اور بڑوں اور بزرگوں کا حاشیہ نشیں بن کر خوشہ چینی کرتا ہے۔ گویا اسلام کے مقدس اور نورانی چہرے کو غبار آلود کرنا آج اعداء اسلام بالخصوص یورپ کے دانش وروں کا طرۂ امتیاز بن گیا ہے۔ ایسے حالات سے نبرد آزمائی کے لیے عصری علوم کے مراکز پستہ قد نظر آتے ہیں۔ علم و تحقیق کے اس قافلے سے معرکہ آرائی اور دشمنان اسلام کو اسلام کے رخ زیبا کی رونمائی وہ مراکز تعلیم و تربیت ہی کر سکتے ہیں جہاں قرآن اور سنت کو مرکزی حیثیت حاصل ہوتی ہے اور جہاں شرح و بسط کے ساتھ اسلام کی زرّیں تعلیمات کو مستند مآخذ و مصادر کے ذریعہ عام کیا جاتا ہے اور طلبہ کے ذہن و فکر کو ان سے مزین و آراستہ کیا جاتا ہے۔

قدیم و جدید فتنوں کا تعاقب: مدارس کے فارغین کی ہی ذمہ داری ہے کہ اسلام کے خلاف مشرق و مغرب کے اٹھتے ہوئے طوفان بلاخیز کا مقابلہ کریں۔ اس سلسلے میں ایک طرف تو ان کے شکوک و شبہات کا رفع و ازالہ کرنا ہوگا، اسلام سے متعلق ان کے اعتراضات کا جواب دینا ہوگا اور متعلقہ موضوعات سے متعلق مثبت انداز سے مستند مآخذ کی روشنی میں اسلام کی حقانیت کو پیش کرنا ہوگا۔ ہاں موثر اور دور رس اثرات و نتائج کے لیے فارغین مدارس کو حالات و ضروریات کے مطابق اپنے آپ کو تیار کرنا ہوگا اور اسلام کی عملی تصویر بنتے ہوئے مخاطب اور مدعو کی زبان پر دسترس حاصل کرنی ہوگی۔ اس سلسلے میں اساتذہ اور ذمہ داران مدارس کا رول بڑا اہم ہوگا۔ انگریزی زبان سکہ رائج الوقت ہے، اگر اس کی قدر کی گئی اور اس میدان میں حذق و کمال پیدا کرلیا گیا تو داعی دنیا کے بازار میں بھی چمکتا ہے اور اس فریضہ منصبی کو بھی کما حقہ ادا کرنے کی پوزیشن میں ہوتا ہے جسے دوسرے لوگ ادا کرنے سے قاصر رہتے ہیں۔ چنانچہ انتظامیہ کو ناگزیر ترین ضرورت کی حیثیت سے مخاطب اور مدعو کی زبان کو باضابطہ شامل نصاب کرنا چاہیے۔ طلبہ و طالبات کی صلاحیتوں میں اس جہت سے کس حد تک افزونی ہو رہی ہے، کون سی خامیاں ہدف مقصود تک پہنچنے میں مانع ہو رہی ہیں اور ان پر کیسے قابو پایا جا سکتا ہے، ان سب پر نظر رکھنا انتظامیہ کا فریضہ ہے۔ اساتذہ کو اس بات کا استحضار و یقین ہونا چاہیے کہ اگر قرآن، سنت اور فقہ میں بصیرت پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ مخاطب کی سمجھی جانے والی زبان میں بھی طلبہ کے اندر ملکہ پیدا کردیں تو گویا حقیقی معنوں میں وہ ایسے مجاہد پیدا کرنے میں کامیاب ہیں جو احساس کمتری سے بالا ہو کر اسلام کے پرشکوہ وجود کو دنیا کے سامنے مستند ترین طریقے سے پیش کر سکیں گے، اسلام کے روشن چہرے پر اغیار کی جانب سے ڈالے گئے گرد و غبار کو صاف کر سکیں گے اور ان کی تہذیب و معاشرت کے نقائص اور معاشرۂ انسانی پر پڑنے والے منفی اثرات کی گرفت بھی

کرسکیں گے۔

جدید دنیا اور تحقیق: آج دنیا اکیسویں صدی کی دوسری دہائی سے گذررہی ہے۔ ریسرچ و تحقیق کے متعدد معرکے سر کیے جارہے ہیں، سائنس اور ٹکنالوجی بھی عروج پر ہے، مادی رفعت و بلندی بھی قابل رشک ہے ،اعلیٰ طرز رہائش اور خورد و نوش کے معیارات بھی قابل فخر ہیں لیکن سچ تو یہ ہے کہ پوری دنیا پر مادیت کا عفریت سوار ہے اور اس کے برعکس روحانیت عنقا ہوتی جارہی ہے اور اخلاقی قدریں روبہ زوال ہورہی ہیں، بلکہ اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ انسانیت ہر چوراہے اور ہر شاہراہ پر شرمسار ہورہی ہے۔ ایسے حالات میں اگر کسی مخصوص قوم وملت کی نشأۃ ثانیہ مقصود ہو تو یا کسی ملک و وطن میں امن و آشتی اور خوشحالی و فارغ البالی مطلوب ہو تو، آج انسانیت کے علم برداروں کو اور امن و آشتی کے متوالوں کو روحانیت کے مراکز کی طرف رجوع کرنا ہوگا، کیونکہ مسیحائی انہی اداروں سے متوقع ہے جہاں بوریوں اور چٹائیوں پر بیٹھ کر اخلاق فاضلہ کے درس دیے جارہے ہوں، جہاں اسلام کی آفاقیت کو ذہنوں میں نقش کیا جارہا ہو اور عالمگیر برادری کے تصور کو تحریک مل رہی ہو، جہاں رواداری، کشادہ ظرفی کا سبق پڑھایا جاتا ہو، دلائل و براہین سے موقف کی وضاحت ہوتی ہو اور مناقشہ و مباحثہ کے رجحانات کی حوصلہ شکنی کی جاتی ہو، جہاں حقوق انسانی کے تحفظ سے متعلق قیمتی اسباق گوش گذار کیے جاتے ہوں، طعنہ زنی اور سب وشتم کے رویہ کو مذموم قرار دے کر دوسرے مذاہب، ان کے پیشواؤں اور ان کے مقدسات کی حفاظت کو فریضۂ منصبی قرار دیا جاتا ہو اور جہاں معاندین اسلام کی جارحیت اور ان کے ذہن و قلم کے بے محابا استعمال اور اشتعال انگیز نتائج کے خلاف فکری اور علمی تیاری کرائی جاتی ہو اور مدعو یا مخاطب معاشرہ کی زبان میں تحریر و تقریر کی مشق و تمرین کرائی جاتی ہو۔

(حواشی)

(۱) محمد بن اسماعیل البخاری: الجامع الصحیح، ج۱، کتاب الایمان، ص۶ (۲) الصف:۲-۳
(۳) النحل:۱۲۵ (۴) فصلت:۳۴ (۵) النساء:۱ (۶) الحجرات:۱۳
(۷) مسلم بن حجاج القشیری: الجامع الصحیح، ج۲، کتاب البر، ص۳۱۸ (۸) الروم:۲۲ (۹) الفرقان:۷۳
(۱۰) البقرہ:۲۰۱ (۱۱) التغابن:۱۵ (۱۲) الکہف:۶ (۱۳) الحدید:۲۷
(۱۴) الحدید:۲۰ (۱۵) مسلم بن حجاج القشیری: الجامع الصحیح، ج۲، کتاب الزہد، ص۴۰۷
(۱۶) ابو عیسیٰ الترمذی: جامع الترمذی، ج۲، ابواب الزہد عن رسول اللہؐ، ص۵۶
(۱۷) الحشر:۱۸ (۱۸) الحدید:۲۱ (۱۹) آل عمران:۱۳۳
(۲۰) احمد بن حنبل: المسند، ج۲، ص۱۴۲ (۲۱) الانعام:۱۰۸ (۲۲) الصف:۸